© rasailojaraid.com

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی

فن اور شخصیت

پروفیسر محمد اسلم، شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی، لاہور

۱۸ دسمبر ۱۹۸۴ء کو رات کے آٹھ بجے پاک و ہند کے نامور مورخ اور اسلامی فنِ تعمیر کے ماہر ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی ۸۸ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔

ان کی وفات سے چند ماہ قبل علی گڑھ سے ڈاکٹر مختار الدین احمد لاہور تشریف لائے تو ان کی خواہش پر میں انھیں چغتائی صاحب کے ہاں لے گیا۔ ان کے ایک فرزند ہمیں چغتائی صاحب کے کمرے میں لے گئے۔ مرحوم اس وقت پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے اور ان کا حافظہ جواب دے چکا تھا۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد نے کئی واقعات دہرائے، لیکن چغتائی مرحوم ہر بات پر یہی کہتے رہے کہ انھیں اب کچھ یاد نہیں رہا۔ ہم تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھ کر چلے آئے۔ یہ مرحوم سے میری آخری ملاقات تھی۔

یہ ۱۹۵۴ء کی بات ہے۔ ان دنوں میں پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے تاریخ کا طالب علم تھا۔ مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کے تلمیذ الرشید ڈاکٹر حمید الدین مرحوم ہمیں تاریخ پڑھانے پر مامور تھے۔ انھوں نے مغلوں کے فن تعمیر پر خود لیکچر دینے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی بجائے یہ کام چغتائی صاحب کو سونپا۔ یوں ان سے میرا تعارف ہوا۔ ۱۹۵۵ء سے پروفیسر محمد شجاع الدین مرحوم نے دیال سنگھ کالج لاہور میں ہر سال ہسٹری کانفرنس اور تاریخی نوادرات کی نمائش منعقد کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ چغتائی صاحب کو اس تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ بھیجا جاتا اور مرحوم بڑے ذوق وشوق سے اس تقریب میں شرکت کرتے اور تحقیقی مقالہ بھی پیش کرتے۔

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی محلہ چابک سواراں لاہور کے رہنے والے تھے۔ یہ محلہ پرانے شہر کے عین وسط میں علامی سعد اللہ کے فرزند میاں خان کی حویلی سے متصل واقع ہے۔ ان کے بزرگوں کا پیشہ معماری تھا اور اس فن میں انھوں نے بڑا نام پیدا کیا تھا۔ چغتائی صاحب کے جدِ امجد میاں صلاح معمار (م ۱۸۵۸ء) مہاراجہ رنجیت سنگھ کے افسرِ تعمیرات تھے اور ان کی نگرانی میں کئی عمارات تعمیر ہوئی تھیں۔ خود چغتائی صاحب کے والد بزرگوار کریم بخش کو بھی اس فن سے بڑی مناسبت تھی اور انھوں نے اپنا ڈاکریٹ کا مقالہ بھی انہی کے نام معنون کیا تھا۔ ہم بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ چغتائی مرحوم کو فنِ تعمیر کے ساتھ دلچسپی اپنے بزرگوں سے ورثہ میں ملی تھی۔

موصوف فنِ تعمیر کی پرانی روایتوں کے امین اور قدردان تھے۔ جب لاہور کی مشہور شاہراہ مال روڈ پر مسجدِ شہداء تعمیر ہوئی تو انھوں نے مسجد بنانے والوں کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ چغتائی صاحب کا یہ موقف تھا کہ مسجد کی تعمیر میں ہماری روایات سے انحراف کیا گیا ہے اور اس کا منار کسی گرجے کا مسلہ (SPIRE) معلوم ہوتا ہے۔ اس مقدمے کا اخبارات میں خوب چرچا ہوا اور مرحوم مسجد کے منار میں تبدیلی کروانے میں کامیاب ہو گئے۔

میں کبھی کبھی ان سے ملنے ان کی قیام گاہ پر چلا جاتا تھا۔ ان کی لائبریری میں حوالے کی تمام کتابیں موجود تھیں۔ وہ صبح نو بجے مطالعہ کی میز پر بیٹھتے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوپہر کے کھانے تک لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے۔ ظہر کے بعد دوبارہ مطالعہ شروع
کر دیتے۔ یہ سلسلہ پانچ بجے تک جاری رہتا۔ اس کے بعد مرحوم ٹہلنے کے لئے گھر سے
نکلتے اور مغرب کی نماز مسجد میں ادا کر کے گھر لوٹتے۔ بڑھاپے اور ضعف کے باوجود وہ
دفتری اوقات میں مطالعہ ضرور کرتے تھے۔

چغتائی صاحب کے دار المطالعہ میں فرش سے لے کر چھت تک ریک بنے ہوئے
تھے جو کتابوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اس کمرے میں بالنس کی ایک سیڑھی بھی رکھی ہوئی
تھی۔ جس طرح جوتوں کی دکان پر سیلزمین سیڑھی لگا کر جوتوں کا ڈبہ اتار لاتا ہے اسی
طرح چغتائی صاحب کتاب اتار لاتے تھے۔ ان کے پاس سلائڈز کا ایک قیمتی ذخیرہ
تھا جو اسلامی فنِ تعمیر کے شہ پاروں پر مشتمل تھا۔

چغتائی صاحب کو کتبوں کے چربے اتارنے میں بڑی مہارت تھی۔ ایک بار انھوں
نے ان چربوں کی نمائش بھی کی تھی۔ انھوں نے راجستھان کی تاریخی بستی "کھاٹو"
کے بارے میں اپنے ایک تحقیقی مقالے میں ایسے کئی کتبوں کا عکس شائع کیا ہے جو
اب "کھاٹو" میں موجود نہیں ہیں۔

چغتائی مرحوم کی تحریروں میں مجھے "کھاٹو" پر ان کا مقالہ بیحد پسند ہے۔ یہ
مقالہ سہ ماہی اردو کراچی میں چھپا تھا اور میں متعدد بار اس کا مطالعہ کر چکا ہوں
اور ہمیشہ لطف اندوز ہوا ہوں۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ان کے انتقال کی شب
میں یہی مضمون پڑھ کر سویا اور صبح ان کی سناؤنی آگئی۔

میں نے ان سے بھی کئی بار اس مضمون کا ذکر کیا اور اپنی پسندیدگی کا اظہار
کیا۔ ایک بار میرے استفسار پر انھوں نے فرمایا کہ انھیں اپنی تحریروں میں "ناگور" کے
بارے میں اپنا مضمون بہت پسند ہے۔ یہ مضمون دکن کالج پونا کے مجلے میں شائع
ہوا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں نے ایک بار ان سے دریافت کیا کہ ان کی زندگی کا بہترین وقت کہاں گذرا ہے؟ چغتائی مرحوم نے جواب دیا کہ دکن کالج پونا میں گذرا ہوا وقت انھیں یاد آتا ہے تو وہ آبدیدہ ہوجاتے ہیں۔ انھوں نے پونا میں قیام کے دوران میں لکھنے پڑھنے کا بڑا کام کیا اور اسے وہ اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے گجرات کاٹھیاواڑ کے دورے کئے اور پروفیسر عبدابراہیم ڈار اور سید ابوظفر ندوی سے مل کر گجرات کے فنِ تعمیر کے بارے میں معلومات اکٹھی کیں اور انھیں کتابی شکل میں شائع کیا۔ ڈار صاحب کے وہ بڑے مداح تھے اور ان کا ذکر بڑی محبت سے کیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے کچھ عرصہ اورنگ آباد میں انجمن ترقیٔ اردو ہند کے صدر دفتر میں مولوی عبدالحق کے ساتھ گذارا تھا۔ اس زمانے کی یادداشتیں انھوں نے محفوظ کرلی تھیں جو مولوی صاحب کے خطوط کے ساتھ اورینٹل کالج میگزین لاہور میں شائع ہوئیں اور علمی حلقوں میں بڑے ذوق وشوق کے ساتھ پڑھی گئیں۔ مولوی صاحب ان کے ساتھ بڑے بے تکلف تھے اور ہلکی پھلکی گالی بھی دے دیتے تھے۔ ان کے نام ایک خط میں مولوی صاحب بڑے خوشگوار موڈ میں لکھتے ہیں:

چھوٹے بڑے نئے پرانے عالم جاہل ہر قسم کے چغتائی کو سلام

چغتائی صاحب کے علامہ اقبال، حافظ محمود شیرانی، ان کے فرزند اختر شیرانی، جسے وہ ہمیشہ داؤد کے نام سے یاد کیا کرتے تھے، مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی، مولانا انور شاہ کشمیری، ڈاکٹر سید عبداللہ، مولوی محمد شفیع اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی جیسے نابغۂ روزگار بزرگوں کے ساتھ بڑے اچھے مراسم تھے۔ علامہ اقبال کی مجلس میں انھیں "ماسٹر جی" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا کیونکہ ڈاکٹریٹ کرنے سے پہلے موصوف لدھیانہ کے کسی سکول میں ماسٹر تھے۔ چغتائی صاحب جتنی دیر اقبال کی مجلس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں بیٹھتے ہنستے ہنسانے کا سلسلہ جاری رہتا۔

انھوں نے علامہ اقبال اور سید سلیمان ندوی کے بارے میں اپنی یادداشتیں محفوظ کر لی تھیں جنھیں انھوں نے مختلف مجلّوں میں چھپوا دیا تھا۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے ساتھ اپنے مراسم کا ذکر انھوں نے ایک کتابچے میں کیا ہے جو دیوبند کے جشن صد سالہ کے موقع پر انھوں نے شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی محفل میں میں نے انھیں کئی بار دیکھا ہے۔ ان کے تعلقات کا سلسلہ ساٹھ پینسٹھ سال پر پھیلا ہوا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کو پہلی بار جب میں نے دیکھا تو وہ براؤن رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھے۔ اس زمانے میں وہ ترکی ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ سیاہ رنگ کے سوٹ میں بھی نظر آجاتے تھے۔ وفات سے چند سال قبل انھوں نے ترکی ٹوپی کی بجائے تاشقندی طرز کی پھولدار ٹوپی پہننا شروع کر دی تھی۔ موصوف اس ٹوپی کی وجہ سے ہزاروں کے مجمع میں پہچانے جاتے تھے۔ میں نے صرف ایک بار، جس روز وہ مجھے اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی کو لاہور کی تاریخی عمارات دکھلانے لے گئے تھے، دھاری دار قمیص اور سفید پاجامے میں ملبوس دیکھا ہے۔ گھر میں وہ تہبند بھی استعمال کر لیتے تھے۔ ان کا لباس عموماً استری سے بے نیاز رہتا تھا۔

اپریل ۱۹۶۷ء میں لاہور میں آل پاکستان ہسٹری اینڈ میوزیم کانفرنس منعقد ہوئی۔ میں فروری میں نو سال کے بعد انگلستان سے واپس آیا اور تین ہفتے بعد علی گڑھ چلا گیا وہاں مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی بیٹی ریحانہ سے میرا عقد ہو گیا۔ مارچ کے اواخر میں میں علی گڑھ سے واپس لوٹا تو پروفیسر سعید الدین احمد ڈار کے توسط سے مجھے اور میری اہلیہ کو کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میری اہلیہ زندگی میں پہلی بار لاہور آئی تھی اس لئے مندوبین کے ساتھ اسے لاہور کے تاریخی مقامات دیکھنے کا موقع مل گیا۔ ایک دن لاہور کارپوریشن نے مندوبین کو شالامار باغ میں چائے کی دعوت دی۔ اتفاق سے میں، میری اہلیہ اور چغتائی صاحب ایک ہی میز پر بیٹھے۔ چغتائی صاحب تکلفات سے کوسوں دور تھے۔ انھوں نے انگوٹھے اور سبابہ کی مدد سے ایک رس گلا اٹھایا اور اسے دانتوں سے کاٹ کاٹ کر کھانے لگے۔ اس کا شیرہ ان کے لباس پر گرنے لگا۔ میری اہلیہ نے حیرت سے ان کی طرف اور پھر میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے اشارے سے سمجھایا کہ اس میں حیران ہونے کی بھلا کیا بات ہے۔ چند منٹ بعد نماز مغرب کا وقت ہوگیا۔ چغتائی صاحب کو وضو کی حاجت تھی۔ انھوں نے کوٹ اتارنے کی بجائے اس کے بازو اوپر چڑھائے اور تالاب کے کنارے بیٹھ کر وضو کرنے لگے۔ میری اہلیہ نے دوبارہ حیرت سے میری طرف دیکھا تو میں نے اسے بتایا کہ موصوف ان کے والد بزرگوار کے دوست ہیں اور انھوں نے مولانا اکبرآبادی کے والد بزرگوار ڈاکٹر ابرار حسین کی آنکھیں دیکھی ہوئی ہیں۔ ہم لوگ پنجاب کے رہنے والے ہیں اس لئے تکلفات میں نہیں پڑتے۔

دسمبر ۱۹۵۵ء میں کراچی میں آل پاکستان ہسٹری کانفرنس منعقد ہوئی۔ اتفاق سے مجھے اور چغتائی صاحب کو ٹرین کے ایک ہی کمپارٹمنٹ میں جگہ ملی۔ مرحوم ہر اسٹیشن پر ٹرین سے اتر کر پلیٹ فارم پر ٹہلنا شروع کر دیتے۔ جب گارڈ وہسل دیتا تو مرحوم فوراً چونکتے اور اپنا کمپارٹمنٹ بھول جاتے۔ میں کھڑکی میں سے آواز دیتا تو لپک کر گاڑی میں سوار ہو جاتے۔ ایک بار موصوف حافظ محمود شیرانی سے ملنے ان کے وطن "شیرانیوں کی ڈھانی" گئے۔ ان کی لاہور کی روانگی سے قبل حافظ صاحب نے ایک خط میں انھیں خصوصی ہدایات دی تھیں کہ وہاں تک پہنچنے کے لئے کس اسٹیشن سے گاڑی بدلنا ہوگی اور کہاں اتریں گے۔ اسی طرح مولوی عبدالحق نے ایک بار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انھیں ہالینڈ بلایا تو سفر کے بارے میں خاص ہدایات دیں جو چغتائی صاحب کے نام ان کے خطوط میں موجود ہیں۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کے لئے سفر کرنا ہفت خوان طے کرنے سے کم نہ ہوتا تھا۔

کراچی پہنچ کر میں اپنے عم مکرم کے ہاں چلا گیا اور چغتائی صاحب نے مندوبین کے ساتھ نارتھ ویسٹرن ہوٹل میں قیام کیا۔ ایک دن ڈاکٹر محمود حسین صاحب (برادر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، صدر جمہوریہ ہند) نے اپنے لیکچر میں اس بات کا گلہ کیا کہ اب انھیں ریسرچ اسکالرز نہیں ملتے۔ جونہی یہ نشست ختم ہوئی چغتائی صاحب مجھے بازو سے پکڑ کر ڈاکٹر محمود حسین کے پاس لے گئے اور ان سے کہنے لگے کہ ایک ریسرچ اسکالر تو یہ رہا، اسے اپنے شعبے میں داخل کر لیجئے۔ چنانچہ مجھے پی ایچ ڈی میں داخلہ مل گیا اور میں نے شاہجہاں کی مذہبی پالیسی پر کام شروع کر دیا لیکن اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے سے قبل ہی میں انگلستان چلا گیا۔

سنہ ۱۹۶۹ء میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی آزادی کے بعد پہلی بار پاکستان تشریف لائے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے ساتھ ان کے دیرینہ مراسم تھے۔ چغتائی صاحب جس زمانے میں تاج محل کے بارے میں پی ایچ ڈی کا مقالہ تیار کر رہے تھے۔ ان دنوں آگرہ میں ان کا قیام مولانا اکبر آبادی کے والد ماجد ڈاکٹر ابرار حسین مرحوم کے ہاں تھا۔ چغتائی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ان پر ان کی شفقت کا یہ عالم تھا کہ ان کے لئے ناشتہ اور کھانا خود اٹھا کر لایا کرتے تھے۔ چغتائی صاحب نے اپنے مقالے کے دیباچے میں ڈاکٹر صاحب کا خصوصی شکریہ ادا کیا ہے۔

چغتائی صاحب نے ایک روز اپنے بیٹے سے کار منگوائی اور مجھے اور مولانا اکبر آبادی کو لاہور کے تاریخی مقامات دکھانے لے گئے۔ انھوں نے ایک فلاسک میں چائے اور دوسری میں ٹھنڈا پانی ڈال کر کار میں رکھ لیا۔ موصوف ہمیں شالامار باغ اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جہانگیر کا مقبرہ دکھانے کے بعد قلعہ لے گئے۔ جون کا غالباً دوسرا ہفتہ تھا اور دن کے گیارہ، سوا گیارہ بجے ہم قلعہ پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب شاہجہانی طرز کی ایک محراب کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی فنی خوبیاں بیان کرنے لگے۔ ایک موقع پر انھوں نے مولانا کو مخاطب کر کے فرمایا: "ذرا اس مرغولے کو غور سے دیکھیے۔" دھوپ اور گرمی کی وجہ سے مولانا بڑے گھبرائے ہوئے تھے اور انھوں نے اچکن اتار کر اپنے بازو پر رکھی ہوئی تھی۔ جب ڈاکٹر صاحب نے ان کی توجہ مرغولے کی طرف مبذول کرانا چاہی تو مولانا نے مجھے کہا، "یہاں گرمی کے مارے جان نکلی جا رہی ہے اور انھیں مرغولے کی پڑی ہے۔" اسی ایک واقعہ سے فن کے ساتھ ان کے لگاؤ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مرحوم اپنے فن کے آخری اُستاد تھے۔

افسوس کز قبیلۂ مجنوں کسے نماند

قلعہ دکھانے کے بعد مرحوم ہمیں اپنے گھر لے گئے۔ کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ انھوں نے اپنے اہل خانہ سے دریافت کیا تو انھوں نے اطلاع دی کہ کھچڑی تیار ہے۔ چغتائی صاحب نے کئی بار دریافت کیا "مولانا کھچڑی کھائیں گے؟" پھر خود ہی زنان خانے میں گئے اور کھچڑی اور دہی اٹھا لائے۔ کہنے کو تو معمولی سا کھانا تھا لیکن جس خلوص اور محبت کے ساتھ ہمیں کھلایا، اس کی یاد ہمیشہ ہمارے دلوں میں تازہ رہے گی۔

چغتائی صاحب ایک بار ہرات تشریف لے گئے۔ وہاں انھوں نے سلطان غیاث الدین غوری کی تعمیر کردہ جامع مسجد، امام فخرالدین رازیؒ کا مقبرہ اور اسی طرح کی کئی تاریخی عمارتیں دیکھیں۔ ہرات سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر زمانۂ قدیم کا بنا ہوا ایک سنگی پل ہے جو "پلِ میلان" کے نام سے مشہور ہے۔ موصوف پاپیادہ وہ پل دیکھنے گئے۔ اس پل کی خوبی یہ تھی کہ اس کی کمان بناتے وقت اس بات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ پتھر مسالے کے بغیر اس ترتیب سے جوڑے جائیں کہ گرنے نہ پائیں۔ ڈاکٹر صاحب جب ہرات سے واپس لوٹے تو انھوں نے اس پل کی بڑی تعریف کی۔

میں جب بھی ان سے ملتا "پلِ میلان" کا ذکر ضرور چھیڑ دیتا۔ ڈاکٹر صاحب بڑے مزے کے ساتھ اس کی فنی خوبیاں بیان کرتے۔ اس وقت ان کی آنکھوں کی چمک دیکھنے کے لائق ہوا کرتی تھی۔ مجھے اس وقت یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ پل کے سامنے کھڑے ہیں اور اسے دیکھ کر اس کی خوبیاں بیان کر رہے ہیں۔

ان کے کمرے میں سلطان الجائیتو خدا بندہ کے مقبرے کی ایک رنگین تصویر دیوار پر آویزاں تھی۔ اس کی کمانیں اور گنبد اس دور کے فنِ تعمیر کا شاہکار ہیں۔ شاید اسی وجہ سے انھوں نے اسے نمایاں جگہ پر لٹکایا ہوا تھا۔

ایک بار موصوف کا پاؤں پھسل گیا اور ان کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ میں عیادت کے لئے حاضر ہوا تو چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے اور ٹانگ پر پلستر لگا ہوا تھا۔ مرحوم اپنے عزم بالجزم سے جلد ہی تندرست ہو گئے اور اپنے گھر سے شہر تک جانے آنے لگے۔

جب ان کی صحت اچھی تھی تو کئی کئی میل پیدل چل پھر لیتے تھے۔ جب وہ کوئی مضمون تیار کر لیتے تو ایک بستہ بغل میں دبا کر کسی اخبار کے دفتر میں پہنچ جاتے۔ اپنا مضمون مدیرِ اخبار کو دکھاتے اور فنی پہلوؤں پر بحث کرتے۔ ان کا مضمون اخبار کے سنڈے ایڈیشن میں بڑی آب و تاب کے ساتھ چھپتا۔ میں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں ان کے بہت سے مضامین جمع کئے تھے، جو اب بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔

ایک بار چغتائی صاحب مجھ سے روٹھ گئے۔ بات یوں ہوئی کہ جب بھی کسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں میرا کوئی مضمون چھپتا، مرحوم میرے نام ایک پوسٹ کارڈ ارسال کرتے اور یہ گلہ کرتے کہ اس مضمون میں فلاں کتاب کا حوالہ کیوں نہیں دیا۔ میں نے ایک بار زچ ہوکر ان کے اور اپنے ایک مشترکہ دوست سے اس کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا "دراصل چغتائی صاحب اس موضوع پر خود کچھ لکھنا چاہتے تھے اور تم ان کا موضوع لے اڑے۔ اب ان کے نزدیک یہ موضوع پامال ہوگیا ہے۔" خود ان کے ساتھ بھی ایسا ہو چکا تھا۔ ہمارے دوست کا ایک مضمون شائع ہوا تو چغتائی صاحب نے ایڈیٹر سے شکایت کی کہ یہ مضمون تو ان کا ہے۔ ایڈیٹر نے پوچھا کہ ان کا یہ مضمون کس مجلے میں چھپا تھا؟ چغتائی صاحب نے جواب دیا کہ وہ بھی اس موضوع پر لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ ایک بار جب چغتائی صاحب کا پوسٹ کارڈ شعبۂ تاریخ کے چپراسیوں اور کلرکوں کی نظروں سے گذرتا ہوا مجھ تک پہنچا تو مجھے بڑی ذہنی کوفت ہوئی۔ میں نے انھیں بڑا سخت خط لکھا۔ اس کے جواب میں ان کا ایک ناصحانہ خط آیا کہ وہ تو میرے بھلے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ تاہم ہماری بات چیت بند ہوگئی لیکن چند ماہ بعد ایک تقریب میں ہماری صلح ہوگئی اور میں دوبارہ ان کے ہاں جانے آنے لگا۔

چغتائی صاحب جس کے دوست ہوتے تھے اس پر جان چھڑکتے تھے اور اگر کسی کے مخالف ہوجاتے تھے تو پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ خان محمد ولی اللہ خاں سے، جو پہلے محکمۂ آثارِ قدیمہ کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور ان دنوں محکمۂ اوقاف کے مشیر آثارِ قدیمہ ہیں، علمی مباحث کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اگر خاں صاحب کسی عمارت کے نیچے کچھ حصہ کو عیدگاہ کی محراب ثابت کرتے تو چغتائی مرحوم اسے جنازہ گاہ کی محراب بتاتے۔ خانِ موصوف اپنی لیبارٹری میں اینٹوں کا تجزیہ کراتے اور اس کی رپورٹ اخبارات میں شائع کرادیتے۔ کئی سال کوٹ خواجہ سعید کی محراب پر ان دونوں بزرگوں کی بحث

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا سلسلہ چلتا رہا۔ اسی طرح شیخ محمد اکرام مرحوم، مصنف کوثر سیریز، کے ساتھ بھی ان کی نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔

جناب گلزار احمد صاحب، جو ان دنوں ٹیکسلا میوزیم کے کیوریٹر ہیں، ایم اے تاریخ کی تیاری میں معروف تھے۔ انھوں نے آرکیالوجی کے دو پرچوں کا امتحان دیا تھا اور اس سلسلے میں انھیں کچھ مواد کی ضرورت تھی۔ چغتائی صاحب کے پاس مطلوبہ مواد موجود تھا لیکن وہ گلزار صاحب کو نوعمر سمجھ کر ٹال دیتے تھے۔ گلزار صاحب نے ایک دن مجھ سے گلہ کیا تو میں نے اسے ایک داؤ سکھایا۔ اگلے روز گلزار صاحب چغتائی مرحوم کے پاس گئے اور ان سے مدد چاہی۔ انھوں نے حسب معمول انھیں ٹالنا چاہا تو انھوں نے کہا "اچھا، اگر آپ میری مدد نہیں کرتے تو میں ولی اللہ خاں سے مدد کی درخواست کروں گا۔" گلزار صاحب کا تیر نشانے پر بیٹھا۔ چغتائی مرحوم فرمانے لگے، اس کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے، وہ کچھ نہیں جانتا۔ تم میرے پاس ہی آجایا کرو، میں ہر طرح سے تمھاری کروں گا۔" گلزار صاحب کا کام بن گیا اور ایک روز وہ میرا شکریہ ادا کرنے آئے۔

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے پیرس یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی تھی۔ مرحوم فرانسیسی زبان سے بھی واقف تھے۔ ۱۹۵۵ء کے لگ بھگ پاکستان میں محکمہ آثار قدیمہ کے سربراہ ایک فرنچ نوجوان تھے جن کا نام موسیو ادریل تھا۔ میں نے ایک تقریب میں انھیں فرانسیسی زبان میں گفتگو کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ پیرس میں قیام کی وجہ سے "موسیو" ان کا تکیۂ کلام بن گیا تھا۔ مرحوم جب بھی مجھ سے بات کرتے تو بار بار موسیو کہہ کر مجھے مخاطب کرتے۔ میں بھی ازرہِ تفنن ان کو اسی لقب سے مخاطب کیا کرتا تھا۔

میرے مخلص دوست اور ہم جماعت پروفیسر بشیر احمد ظاہری گورنمنٹ ڈگری کالج بھکر کے پرنسپل تھے۔ وہ ہر سال اپنے کالج میں یومِ اقبال منایا کرتے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس موقع پر وہ اسپیشل ویگن لے کر آتے اور لاہور سے متعدد اسکالرز کو ہمراہ لے جاتے۔ ایک بار ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، مولانا عبداللہ قریشی، سید نذیر نیازی، ڈاکٹر [illegible] ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اور راقم الحروف شریک سفر تھے۔ جب ہماری ویگن کامونکی سے آگے بڑھی تو چغتائی صاحب بار بار مجھ سے پوچھتے، "مونسیو! یہاں سادھوکی نام کی ایک بستی ہوا کرتی تھی وہ کب آئے گی؟" وہ بار بار یہی فقرہ دہراتے یہاں تک کہ تمام ساتھی ہنسنے لگے اور پھر موصوف خود بھی ہنس پڑے۔ مولانا عبداللہ قریشی ہر تھوڑے وقفے کے بعد مجھ سے پوچھتے، "کیوں بھئی ابھی سادھوکی نہیں آیا؟" چغتائی صاحب بھی اس تکرار سے محظوظ ہوتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب آزادی کے بعد کسی مستشرق کے ساتھ بذریعہ کار بھارت تشریف لے گئے۔ انھوں نے جالندھر سے ہوشیارپور، روپڑ اور انبالہ کا راستہ اختیار کیا۔ میں نے ان سے ہوشیارپور سے لے کر سرہند تک کے علاقے کی تعریف کئی بار سنی ہے۔ اس راہ میں انھوں نے پرانے مقبروں اور مسجدوں کے آثار دیکھے، جن کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ کیا کرتے تھے۔

ایک دن چغتائی صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ جب علامہ اقبال کی میت قبر میں اتاری گئی تو ان کے برادر بزرگ عبدالرحمٰن چغتائی قبر میں اترے اور انھوں نے علامہ مرحوم کا آخری دیدار کیا۔ عبدالرحمٰن کہا کرتے تھے کہ علامہ صاحب کا آخری دیدار کرنے کی سعادت ان کے حصے میں آئی ہے۔

ایک روز چغتائی صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ وہ برٹش میوزیم میں مطالعہ میں مصروف تھے کہ میوزیم کا ایک ذمہ دار افسران کے پاس آیا اور ان سے کہنے لگا کہ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ بنو اُمیہ کے جھنڈے کا رنگ کیا تھا؟ چغتائی صاحب اس وقت تو کوئی جواب نہ دے سکے لیکن چند منٹ بعد انھوں نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لوئی کتاب اٹھائی تو اس میں اس جھنڈے کی تصویر موجود تھی۔ موصوف فوراً وہ کتاب لے کر اس افسر کے پاس گئے۔ اس نے فوراً پانچ پونڈ کا ایک نوٹ ان کی خدمت میں پیش کیا۔

چغتائی صاحب کے بڑے صاحبزادے عبدالرؤف نے راقم الحروف کو بتایا کہ چغتائی صاحب کی کردار سازی میں ان کی اہلیہ مرحومہ کا بڑا ہاتھ تھا۔ جس وقت ان کی شادی ہوئی اس وقت وہ انڈر میٹرک تھے۔ میٹرک کا امتحان شادی کے بعد پاس کیا اور پھر پی، ایچ ڈی تک تعلیم پائی۔ لوگ عموماً شادی کے بعد تعلیم ترک کر دیتے ہیں لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس تھا۔

چغتائی صاحب کی وفات سے چند ماہ قبل اینا میری شمل لاہور آئیں اور انھوں نے عجائب گھر سے ملحقہ آڈیٹوریم میں مسلمانوں کے فن تعمیر کے بارے میں لیکچر دیا۔ چغتائی صاحب بڑھاپے اور نقاہت کے باوجود وہاں پہنچے لیکن آڈیٹوریم میں جانے کی ہمت نہ ہوئی اور باہر ہی کرسی ڈال کر بیٹھ گئے۔ میری ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ ان کا سر ہلنے لگا ہے اور حواس بھی درست نہیں رہے۔ میں نے خیریت پوچھی تو حسب معمول "فضل" کہا۔ میں نے سوال کیا کہ اب لکھنے پڑھنے کا کیا حال ہے؟ انھوں نے ہاتھوں کے اشارے سے بتایا کہ اب کچھ نہیں کرتے۔ میں ان کی حالت پر افسوس کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

چغتائی صاحب کے تین بیٹے ہیں۔ سب سے بڑا بیٹا عبدالرؤف، جو شکل و شباہت میں ہو بہو ان سے ملتا ہے، اسٹیشنری کی دکان پر بیٹھتا ہے۔ اس دکان کا آغاز چغتائی صاحب نے کیا تھا اور اس کا نام "کتاب خانہ نورس" رکھا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اسے "کاپی بک شاپ" کہنے لگے۔ میں نے وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب چغتائی صاحب خود اس دکان پر بیٹھا کرتے تھے۔

© rasailojaraid.com

ان کا دوسرا فرزند عبدالاحد ہے۔ انھوں نے آکسفورڈ سے فنِ تعمیر میں سند لی۔ اِن دنوں وہ آرکیٹکٹ ہیں۔ ان کا تیسرا فرزند عبدالخالق محکمہ ریلوے میں چیف انجینئر ہے اور اِن دنوں ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ ہے۔

صلبی اولاد کے علاوہ ان کی تصانیف کو ہم ان کی معنوی اولاد کہہ سکتے ہیں۔ ان کی تصانیف میں سے تاج محل، مسجد وزیر خاں، بادشاہی مسجد، تاریخ اکمی لاہور، اسلامی کوزہ گری اور اسلامی مصوری، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ ان کے صدہا مقالے علمی اور ادبی جرائد کی فائلوں میں محفوظ ہیں۔ یہ ان کے لائق و فائق فرزندوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے والد بزرگوار کے اس علمی سرمائے کو کتابی صورت میں محفوظ کرلیں۔

چغتائی صاحب کی نماز جنازہ دو بار ہوئی۔ پہلی نماز جنازہ مفتی محمد حسن امرتسریؒ کے فرزند مولانا عبدالرحمٰن نے مین مارکیٹ گلبرگ کے راؤنڈ اباؤٹ میں پڑھائی۔ راقم نے بھی اس میں شرکت کی سعادت حاصل کی۔ دوسری نماز میانی صاحب کی جنازگاہ میں ہوئی اور اس میں ان لوگوں نے شرکت کی جو گلبرگ نہیں پہنچ سکے تھے۔

چغتائی صاحب کو قبرستانِ میانی صاحب میں ان کی اہلیہ کی قبر سے متصل دفن کیا گیا۔ ان کی قبر کے قرب و جوار میں تاجِ زریں رقم، احمد حسین مدیر شباب اردو، استاد شریف خاں ستار نواز، سید فدا حسین، حضرت مولانا شہاب الدین [illegible]، ڈاکٹر مفضل الرحمٰن اور مولانا نور الحق جیسے مشاہیر محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ۔